فہرست

لمعات: (کیا قانون عدل پر مبنی ہے؟)	ادارہ	3
عمران خان صاحب کی کتاب ''میں اور میرا پاکستان'' قرآن کے آئینہ میں	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	4
قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	علامہ غلام احمد پرویزؔ	13
مکتوبات	محمد اکرم راٹھور	38

ENGLISH SECTION

Concept of God (Letter to Saleem)
By G.A. Parwez,
English Rendering by
Brig. Taimur Afzal Khan (Retd) 64

طلوعِ اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب، دروس القرآن کی تمام جلدیں، اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بک سیلرز، 42، دی مال (ریگل چوک)، لاہور۔	فون: 042-37312977، موبائل: 0300-4442226
2- سانجھ بک سیلرز، بک اسٹریٹ 46/2، مزنگ روڈ، لاہور۔	موبائل: 0333-4051741
3- مسٹر بکس، بک سیلرز، سپر مارکیٹ، اسلام آباد۔	فون: 051-2824805-2278843
4- البلال بک ڈپو، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0344-2502141	5- شہباز بک ایجنسی، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32632664
6- مذہبی کتب خانہ، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0331-2716587	7- شاہ زیب انٹر پرائزز، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32214259
8- علمی کتاب گھر، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32628939	9- مکتبہ دارالسلام، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32212269
10- مکتبۂ دارالقرآن، اردو بازار، کراچی۔	11- محمد علی، کارخانہ اسلامی کتب، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32631056

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کیا قانون عدل پر مبنی ہے؟

ہر معاشرتی زندگی کے نظام کی بنیاد افکار پر ہوتی ہے۔ ہر دور میں ایک گروہ ہوتا ہے جس میں شامل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پورا معاشرہ اس لئے وجود میں آیا ہے کہ ان کے سامنے صَف بستہ رہ کر ان کے مفادات کی نگرانی' خواہشات کی تکمیل اور جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کرے۔ وہ حاکم ہیں اور باقی سب محکوم۔ اس قسم کے اندازِ فکر سے پوری سماجی زندگی میں عملی اعتبار سے ایک عدمِ توازن پیدا ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اس عدمِ توازن کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے دیگر متبادل تبدیلیوں کے راستے کھلتے جاتے ہیں اور پھر یہ ایک ایسے فساد کو جنم دیتے ہیں جس سے انسانیت جھلس کر رہ جاتی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک انتشار و افتراق اور فسادِ آدمیت کے جہنم سے محفوظ و مامون رہے تو سب سے پہلے ہمیں لَا اِلٰہَ کی منزل کو عبور کرنا ہوگا یعنی انسانوں کے وضع کردہ نظامِ زندگی سے انکار کرنا ہوگا اور اس کے بعد اِلا اللہ یعنی اللہ (قرآن) کے مقرر اور متعین کردہ نظامِ حیات کو اپنانا ہوگا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت ملک میں جس ''نظامِ شریعت'' کے نفاذ کا شور و غوغا بلند ہے یہ بھی خدا اور اس کے رسول کے نام پر انسانوں ہی کے وضع کردہ خود ساختہ نظام کا بُت ہے۔ اس کا خدائے واحد کے عطا فرمودہ نظامِ حیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ خدائے واحد کے عطا فرمودہ نظامِ حیات کا پہلا ستون احترامِ انسانیت اور اس کے پیشِ نظر عدل و احسان ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عدل و احسان پر مبنی معاشرتی نظام کو ہر سطح پر پوری دیانت داری کے ساتھ نافذ کریں۔ عدل کے سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت کو ہمیں پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق' عدالت کا منصب ملک کے مروجہ قوانین کے مطابق متنازع معاملات کے فیصلے کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی فیصلہ مروجہ قانون کے مطابق ہوگا تو اسے مبنی بر عدل کہا جائے گا لیکن اگر وہ قانون ہی ''عدل'' پر مبنی نہ ہو تو ان کے مطابق فیصلہ مبنی بر عدل کس طرح قرار پائے گا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ملک کا قانون بھی عدل پر مبنی ہونا چاہئے۔ عدل کیا ہے اور ظلم کیا' اس کے لئے قرآنِ کریم ایک کسوٹی پیش کرتا ہے اور وہ کسوٹی یہ ہے کہ: **مَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)**- جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو ان ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

عمران خان صاحب کی کتاب

''میں اور میرا پاکستان'' قرآن کے آئینہ میں

ہمیں عمران خان سے اس وقت سے محبت ہے جبکہ وہ سیاست میں نہیں آئے تھے کیونکہ انہوں نے پاکستان کا نام ساری دنیا میں روشن کیا تھا۔ اس کے بعد یہ خبریں آنی شروع ہوئیں کہ ان کا کچھ رجحان قرآن کریم کی طرف ہوگیا ہے۔ اس خبر کی وجہ سے ان سے مزید تعلق اور محبت پیدا ہوگئی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

أَوَ مَن كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122)-

''تم اپنی اور اس کی حالت کا موازنہ اس طرح کرو کہ ایک شخص مردہ ہو، اسے از سرِ نو زندگی عطا ہو جائے، اس کے بعد اسے ایسی نورانی قندیل (قرآن) دے دی جائے جس سے وہ شخص خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستہ پر چلائے۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے جو سخت تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں، ہرگز نہیں۔''

ہمیں جب بھی عمران خان کی رجعت الی القرآن کے متعلق کوئی بھی امید بندھتی تو یہ آیۂ کریمہ سامنے آجاتی اور لبوں پر یہ دعا آجاتی کہ کاش عمران خان اس آیہ کریمہ کے مطابق نئی زندگی حاصل کر کے قرآن کریم ہاتھ میں لے کر، اس کی روشنی دنیا میں پھیلاتے پھریں۔ آج دنیا جس قدر قرآنی نظام کے لئے بے چین ہے، اس سے پیشتر کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، نیز یہ کہ قرآنی نظام قائم کرنے کے روشن مواقع بھی اس سے پیشتر کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ آج مصر، لیبیا خصوصاً تیونس بالکل صاف سلیٹ کی طرح موجود ہیں۔ وہاں بسہولت اور بآسانی قرآنی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ تیونس میں جناب راشد غنوشی صاحب کی وجہ سے اور مصر میں اخوان المسلمون کی وجہ سے اسلامی نظام کی طرف واضح رجحان پایا جاتا ہے لیکن افسوس کہ وہاں اسلامی نظام (دین) کا کوئی واضح تصور نہیں ہے، وہ سب ''مذہب'' کے اندھیروں میں گھرے ہوئے ہیں اور ڈر اس بات کا ہے کہ وہ

''مذہب'' کو ہی بطور دین کے نافذ کرنے کی کوشش کریں گے' اور اس طرح ناکامی سے دوچار ہوں گے ان کے ہاں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو دین اور مذہب کا فرق ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس سے پیشتر ایران میں یہ انقلاب اسی طرح ناکام ہوا ہے۔ انہوں نے مذہب کو ہی دین بنا کر نافذ کرنا چاہا' جبکہ مذہب اور دین بالکل ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔

عمران خان سے ہماری توقعات کوئی بے جا نہیں ہیں۔ ان میں جذبہ ہے' وہ جوانوں میں مقبول ہیں۔ عوام میں ان کا اثر بھی بڑھ رہا ہے' لیکن ان کی یہ کتاب پڑھ کر ہماری توقعات پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ پورے طور سے مذہب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان سے ہمیں محبت اور توقعات ہیں۔ اس لئے یہ چند سطور تحریر کی جا رہی ہیں۔ عمران خان اور تحریک انصاف سے وابستگان نہایت معروف حضرات ہیں۔ اس لئے اس مضمون کو حد درجہ مختصر رکھا گیا ہے۔ جن نکات کو پیش کرنا ضروری سمجھا گیا' انہیں پیش کر دیا گیا ہے۔ ان کی تائید میں جو دلائل دینے ضروری ہیں ان کے صرف حوالے دے دیئے گئے ہیں وہ تحریک طلوع اسلام کے لٹریچر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ عمران خان نے اپنی کتاب میں جن حضرات کے نام تحریر کئے ہیں وہ عمداً نظر انداز کر دیئے گئے ہیں تاکہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

عمران خان نے اپنے نظریات کی تبدیلی کو اپنا روحانی سفر تحریر کیا ہے (ص 105)۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے خود ہی تحریر کر دیا کہ ''جیسے میرا ایمان پختہ ہوا تو زندگی کے بارے میں میرا زاویہ نگاہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا اور میں نے اپنے کردار کی اصلاح کا آغاز کیا۔ جو لوگ اس عقیدہ کے تحت جیتے ہیں کہ انہیں دنیا کے اعمال کے لئے آخرت میں جواب دہ ہونا ہے وہ ان لوگوں سے مختلف زندگی گذارتے ہیں جو صرف اس دنیا کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں' اگر میں اس داخلی تبدیلی سے نہ گذرا ہوتا' تو وہی زندگی گذار رہا ہوتا جس میں انسان کا مطمح نظر دنیاوی لذتوں کا حصول ہے (ص 106)۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے خود تحریر کر دیا کہ ''میرا زاویۂ نگاہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔'' پھر اس سے آگے وہ فرماتے ہیں ''میں قرآن مجید کی اس ہدایت سے متاثر ہوا کہ جو ضرورت کا ہے وہ پاس رکھو اور باقی اللہ کی راہ میں خرچ کر دو (ص 107) یہاں بھی ان کی فکر قرآن سے متاثر ہوئی ہے اس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے' ایک ٹی وی چینل میں انہوں نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا تھا کہ قرآن میں جو یہ حکم ہے کہ دشمنوں سے بھی عدل کرو (5:8) تو قرآن کے اس حکم سے وہ بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ یہ ان کا ایک فکری سفر ہے اور قرآن کریم پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ یقیناً اس فکر سے متاثر ہو گا' وحی الٰہی میں خود اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ ہر عقل مند اور مفکر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے تو قرآن کریم میں روح خداوندی کا ذکر تو موجود ہے' لیکن روح انسانی کا کوئی تذکرہ قرآن میں نہیں ہے۔ روح اور روحانیت کے موضوع پر تحریک طلوع اسلام میں بہت بڑی تعداد میں لٹریچر موجود ہے' اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے یہاں صرف اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال میں روح کے

اس غلط تصور کا بہت بڑا کردار ہے' جو قوم بھی جس درجہ روحانیت کے سمندر میں ڈوبتی چلی جاتی ہے وہ اسی درجہ اس دنیا میں زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو روحانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے' وہ دنیا سے بیزار اور ''مستغنی'' ہوتا جاتا ہے۔

نزول قرآن کے وقت روح کے یہ معنے ہی نہیں تھے۔ قرآن کریم نے اس کو وحی کے معنے میں استعمال کیا ہے' جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں در آیا' تو انہوں نے روح کے معنے 'Soul' اور Spirit کے لینے شروع کر دیئے اور یہی معنے اب ہمارے ہاں اس کے متداول ہیں۔ روح کا لفظ قرآن میں بیس (20) مرتبہ آیا ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(1) پانچ مرتبہ روح بمعنی وحی' (قرآن کریم آیا ہے۔ 97:4, 42:52, 40:15, 17:85, 16:2

(2) دو مرتبہ وحی لانے والے جبرئیل کے لئے۔ 26:193, 16:102

(3) چار مرتبہ وحی کا مترادف مفہوم بمعنی وحی کی تعلیم۔ 2:87, 2:253, 5:110, 58:22

(4) تین مرتبہ اللہ کی وحی پانے والے حضرت مسیح کے لئے۔ 4:17, 21:91, 66:12 میں آیا ہے۔

(5) ایک مرتبہ حضرت ذکریا کے لئے آیا ہے 19:17 میں اور ایک مرتبہ جملہ انبیاء کرام کے لئے 78:38۔

(6) ایک مرتبہ بمعنی مطلق وحی الٰہی مذکور ہے 70:4 میں۔

(7) تین مرتبہ وہ توانائی جو انسان کو عطا ہوئی۔ 15:28, 32:7, 38:71۔

یہ وہ بیس مقامات ہیں جہاں روح بمعنی وحی اور وحی پانے والا' کے استعمال ہوا ہے' کسی ایک جگہ بھی روح بمعنی Soul یا Spirit کے استعمال نہیں ہوا۔

انسانی روح نہ ہونے کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

(1) ہم مسلمانوں میں انسانی روح کا تصور موضوع احادیث کے ذریعہ آیا ہے۔ ان احادیث کی تفصیل تحریر کرنے سے مضمون طویل ہوتا ہے۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو پیدا کیا تو اس وقت ہی قیامت تک کے لئے ضرورت کے مطابق کروڑوں ارواح کو پیدا کر لیا تھا۔ ان ارواح کا ذخیرہ اب موجود ہے' اب ہر بچہ کے پیدا ہونے پر اس ذخیرۂ ارواح میں سے ایک روح کو لے کر اس بچے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جب وہ جسم مرتا ہے تو وہ اس جسم سے نکل جاتی ہے اور پھر قیامت کے دن اس روح کو اس جسم میں ڈال کر جسم زندہ کر دیا جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں 4 ماہ کا ہوتا ہے تو یہ روح اس کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان کا نطفہ Sperm تو خود زندہ ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی دلیل یہ ہے کہ وہ حرکت کرتا ہے' اور اب تو میڈیکل سائنس نے بھی اس کی زندگی کی تصدیق کر دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب نطفہ خود زندہ ہوتا ہے تو اس میں روح ڈالنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

دوسری بات یہ قابل توجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنین کے مراحل کا بہت تفصیل سے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ رحم

مادر میں نطفہ سے علقہ' اس سے مضغہ' پھر استخوان' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھنا' پھر انسانی شکل میں منتقل ہونا' وہ مراحل ہیں' جو قرآن میں مذکور ہیں 23:14' ان تمام مراحل میں قرآن نے کسی جگہ ادخال روح کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ممکن نہیں کہ جسم انسانی میں روح ہوتی ہو اور قرآن اس کو بیان نہ کرے۔

یہ موضوع بہت طویل اور ختم نہ ہونے والا ہے' طوالت کے خوف سے اس کو یہاں ہی ختم کیا جاتا ہے لیکن اس درخواست کے ساتھ کہ تحریک انصاف روح اور روحانیت کے چکر میں نہ پڑے ورنہ وہ مسلمانوں کے لئے مزید نقصان دہ ثابت ہوگی۔ (اگر اس موضوع پر مزید مواد درکار ہو' تو وہ پیش کیا جاسکتا ہے)۔

عمران خان صاحب کو جو چیز روح اور روحانیت کی طرف لے گئی وہ عجیب بات معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی اس کتاب میں دو تین مقامات پر ایسے واقعات تحریر فرماتے ہیں جن میں ایک صاحب نے انہیں آئندہ کے حالات بتا دیئے اور چند وہ حالات بتائے جو ان کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھے' عمران خان نے ان صاحب کے متعلق فرمایا کہ وہ ''ممکن ہے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں'' آئندہ کے حالات و واقعات بتا دینے کی صلاحیت سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ روحانیت کے بھنور میں پھنس گئے۔

انسان کی طبیعت میں یہ بات راسخ ہے کہ وہ مافوق الفطرت چیزوں کو appreciate بھی کرتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے' عام سطح کے لوگ علمی گفتگو سے کم متاثر ہوتے ہیں اور مافوق الفطرت چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انبیاء کرام سے معجزات طلب کرتے تھے۔ آپ غور فرمائیں کہ حضورﷺ اپنے مخالفین سے یہ فرماتے تھے کہ قرآن کریم بہترین ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا موضوع بہترین معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے' جو قوم اس ضابطۂ حیات کو اختیار کرلے گی وہ فلاح پا جائے گی' وہ اس کے جواب میں آپ سے معجزہ طلب کرتے تھے' آپ غور فرمائیں کہ کسی خلاف فطرت کام سرانجام دینے سے یہ کیسے ثابت ہوسکتا ہے کہ قرآن بہترین ضابطہ حیات ہے' اب بھی ہمارے ہاں جو عام سطح پر سوچنے کے عادی ہیں وہ ہی معجزات اور کرامات کے قائل ہیں ورنہ علمی دنیا میں معجزات' کرامات اور مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔

آئندہ کی معلومات حاصل ہونا' یا مستقبل میں جھانکنے کا نظریہ بھی روحانیت اور مافوق الفطرت تصورات پر قائم ہے اور اس سے بڑے بڑے Intellectuals بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ ہمارے دور میں اندرا گاندھی اور جناب ذوالفقار علی بھٹو شہید سے منسوب واقعات بتائے جاتے ہیں' جو اپنے الیکشن کے لئے آئندہ کے حالات معلوم کرنے کے قائل تھے۔ مغربی ممالک میں اب بھی Crystal Ball پر یقین کیا جاتا ہے۔ Sidcup, Kent میں اب بھی ایک Crystal Ball کے ذریعے آئندہ کے حالات بتاتی ہیں اور ہمارے چند دوست ان سے رابطہ رکھتے ہیں لیکن آئندہ کے حالات معلوم کرنے کا نظریہ بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ حضورﷺ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں آئندہ کے حالات

معلوم نہیں تھے۔ (7:188) تو دوسروں کو کس طرح ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ آئندہ کے حالات بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں' ان کا اسلام یا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فنی چیز ہے۔ ہندو سادھو اس سے بھی زیادہ کے دعاوی کرتے ہیں۔

علم حاصل کرنے کے صرف دو ذریعے ہیں۔ ایک عقل انسان (17:36) اور دوسرے وحی الٰہی (42:51) قرآنِ کریم کی رو سے ان دو ذریعوں کے علاوہ اور کسی ذریعے سے علم حاصل نہیں ہو سکتا' الہام' کشف' القاء' استخارہ' تفاول' ضمیر' چھٹی حس' وجدان رویائے صادقہ Intiution سب باطل اور خلاف قرآن نظریات ہیں۔ یہ سب نظریات قرآن کریم کے خلاف ایک گہری سازش کا نتیجہ ہیں اور قرآنِ کریم کی اہمیت کم کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

ختم نبوت کے بعد وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور وحی الٰہی کو قرآن کریم میں جمع کر دیا گیا۔ اب علم حاصل کرنے کے صرف دو ذرائع ہیں ایک قرآن کریم اور دوسرے عقل انسانی۔ ان دو کے علاوہ اور کوئی ذریعہ علم حاصل کرنے کا نہیں ہے۔ اس لئے آئندہ کا علم حاصل ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا اور کوئی شخص کسی طرح بھی مستقبل میں نہیں جھانک سکتا۔ (عقیدہ الہام کی تردید میں ہماری Web ملاحظہ فرمائیں۔)

یہاں تک جو کچھ تحریر کیا گیا ہے ان میں جناب عمران خان صاحب کے نظریات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ ان کے ذاتی نظریات ہیں اور ان کا حق ہے جو نظریات وہ چاہیں اختیار کریں لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک پارٹی کے قائد ہیں اور ہمیں ان سے بڑی توقعات ہیں۔ ان توقعات کے پیش نظر ہم یہ چند گذارشات پیش کر رہے ہیں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ تحریک انصاف کے قائدین ان گذارشات کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کریم میں مذہب کا لفظ کسی جگہ استعمال نہیں ہوا ہے قرآن کریم اپنے کو دین کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کی بدنصیبی اور ان کے زوال کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو بجائے دین کے مذہب میں تبدیل کر دیا مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا وجود فرد متعلقہ کے ذہن سے باہر خارج میں نہیں ہوتا' مذہب میں اللہ اور بندے کے درمیان تعلق پوجا پاٹ یا پرستش کی چند رسوم کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے اور یہ خیال کر کے آدمی اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو گیا ہے' ظاہر ہے کہ یہ ایک خالصتاً انفرادی اور داخلی اور Subjective احساس ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذہب انسانیت کے مسائل سلجھانے کا بھی کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ یہ دنیا کی کسی بھی Problem کا حل پیش نہیں کرتا۔ مذہب کے نتائج بھی اس دنیا میں سامنے نہیں آتے۔ اس وجہ سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس کا مذہب درست ہے۔ اس کے برخلاف دین ایک نظام ہوتا ہے' جو قوانین خداوندی کی اساس پر اٹھایا جاتا ہے اور اس کا دائرہ زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہوتا ہے۔ اور موجودہ دور میں اس کو مملکت کہتے ہیں۔ انبیاء کرام سب دین لے کر آتے تھے لیکن بعد میں ان کے پیروکار دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے اور مذہبی پیشوائیت اس مذہب کی اجارہ دار ہو جاتی تھی۔ نوح علیہ السلام کے بعد سے یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ

حضورﷺ کی بعثت ہوئی اور حضورﷺ نے اپنے عہد مبارک میں دین کا نظام جاری فرما دیا۔ قرآن کریم نے شخصیات کا دور ختم کر کے' دستور اور نظام کا دور شروع کر دیا قرآن کریم نے انسان کی حکومت انسان پر ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔ قرآن کریم کا یہ نعرہ نہایت انقلاب انگیز تھا اور آج سے اتنے عرصہ پیشتر اس دور میں اس کو بلند کرنا قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ قرآن کی رو سے حضورﷺ کی ذاتی' شخصی اطاعت ضروری نہیں تھی (58:1 ,33:37) بلکہ آپ کی Functional اطاعت سب پر لازم تھی۔ حضورﷺ کے اپنے دور میں اسلامی مملکت دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ حضورﷺ نے اپنی اس مملکت میں اولامر 4:53' اور حکام مقرر فرما دیئے تھے 2:186' یہ مقامی حکام تھے جو مختلف مقامات پر لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے اور ان مقامی حکام کے فیصلے کی اطاعت ہی حضورﷺ کی اطاعت ہوتی تھی کیونکہ یہ اس نظام کی اطاعت ہوتی تھی جو حضورﷺ نے قائم فرمایا تھا۔

قرآنِ کریم کی رو سے مومن اور کافر کا امتیاز ہی یہ ہے کہ:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)-

جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ کافر ہے۔

حضورﷺ کو بھی یہی حکم عالی ہوا تھا:

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ (5:48)-

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

اس طرح کے فیصلوں کی اطاعت مسلمانوں پر لازمی تھی۔ قرآن میں جس جگہ بھی اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' اس سے مراد ان ہی فیصلوں کی اطاعت ہے' یہ نظام چونکہ وقتی یا ہنگامی نہیں تھا' بلکہ اس کو قیامت تک کے لئے جاری رہنا تھا' اس لئے حضورﷺ کی اطاعت' حضورﷺ کے بعد اس زندہ محسوس اتھارٹی کی طرف منتقل ہونی تھی' جو اس نظام کو جاری رکھے ہوئے تھی لہٰذا حضورﷺ کے بعد یہ اطاعت حضرت ابوبکرؓ کی طرف منتقل ہوئی اور حضورﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ یہ نظام کچھ عرصہ بعد منقرض ہو گیا' اور خلافت راشدہ کے فوراً بعد ملوکیت نے غلبہ حاصل کر لیا اور اس کے بعد اموی اور عباسی اور فاطمی خلفاء کی حکومتیں قائم ہو گئیں' جس دن اسلامی نظام ختم ہوا' اسی دن اللہ و رسول کی اطاعت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ مسلمانوں کی غلط فہمی ہے کہ وہ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف اس نظام کے ذریعے ہو سکتی ہے' جو قوانین خداوندی کی اساس پر قائم کیا جاتا ہے۔ قرآن نے ہر اس معاشرہ کو جو وحی کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے اسے دین کہا ہے' اور ہر وہ معاشرہ جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر قائم ہوتا ہے قرآن کریم اس کو طاغوت کے نام سے موسوم کرتا ہے اور واضح حکم دیا ہے کہ طاغوت میں زندگی بسر کرنا بالکل منع ہے (4:90) اور اس عقیدہ پر امت مسلمہ کے تمام فقہاء اور علماء کا اتفاق ہے کہ دین کا قائم کرنا ہر

شخص پر فرض ہے اور دین کا قائم کرنا مسلمانوں کی Minimum Requirement ہے۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جو خلافت راشدہ کے بعد' دین کے قیام کے لئے اٹھی ہے اور تحریک انصاف سے یہ جائز توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی اس نظام کو قائم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے جو وعدے کئے ہیں' وہ اس کے نظام کے ذریعے سے ہی پورے ہوتے ہیں' اس نظام کے قیام کے بغیر وہ وعدے پورے نہیں ہوسکتے' اور نہ ہی انسانیت کو سکون نصیب ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِيْ الْأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللّهِ رِزْقُهَا (11:6)-

زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔

پھر فرمایا:

نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6:151 ,17:31)-

ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتے ہیں۔

ہر متنفس کو رزق پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ آسمان سے روٹیاں نہیں پھینکتا بلکہ یہ رزق اس نظام کی معرفت فراہم ہوتا ہے۔ جو نظام یہ رزق مہیا کرتا ہے' اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی ایسا نظام قائم ہے جس میں ہر متنفس کو رزق نہیں ملتا' تو اس نظام کی اطاعت فرض نہیں رہتی۔ اسی لئے حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر کسی اسلامی مملکت میں بھی ایک فرد کو رزق نہیں ملتا اور اس نے ایک رات بھوک میں گذار دی تو اس بستی سے اس نظام کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو اس میں جانوروں کو بھی شامل کرلیا ہے' انہوں نے فرمایا کہ اگر ایک کتیا بھی فرات کے کنارے بھوکی مرگئی تو اس کی باز پرس عمر سے ہوگی۔ قرآن نے حکم دیا:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (5:8)-

اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو' (خبردار) تم ہر حال میں انصاف کرو۔

واضح رہے کہ قرآن کریم صرف اپنے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے کو عدل شمار کرتا ہے (17:181)- انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلوں کو وہ عدل نہیں گردانتا۔ وہ معاشرے جن میں اوپر کے طبقے کے لوگوں کو Immunity حاصل ہو' جس میں امراء و وزراء کو Privilges ملتی ہوں۔ جہاں اربوں روپوں کی رقوم کو Write-off کر دیا جاتا ہو' جہاں رشوت اور کرپشن زندگی کا معمول ہو' جہاں صرف اقربا اور اعزہ ہی بڑے بڑے مناصب حاصل کرسکتے ہوں۔ اور ملک کی نصف سے زیادہ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گذار رہی ہو' اس ملک کے قوانین کے مطابق فیصلوں کو قرآن عدل قرار نہیں دیتا۔ یہ نکتہ تحریک انصاف کے لئے خاص توجہ کا طالب ہے کہ اگر وہ ملک میں انصاف جاری کرنے کے لئے اٹھے ہیں' تو ان کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن کا نظام جاری کریں۔ قرآنی نظام میں دو باتیں بنیادی

اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس نظام میں ہر شخص کو رزق فراہم ہوتا ہے اور دوسری بات یہ ضروری ہے کہ اس نظام میں ہر شخص کو اپنی مضمر صلاحیتوں کو نشو ونما حاصل کرنے کے پورے پورے مواقع حاصل ہوں۔ ہر شخص کی خوابیدہ صلاحیتوں (Dormant Potentialities) کو بیدار کرنا' اس نظام کا فرض ہوتا ہے (2:129, 9:103) اگر اس نظام میں ایک بچے کی بھی صلاحیتیں پروان نہ چڑھتی ہوں تو وہ اسلامی نظام نہیں ہے۔ اس نظام میں دوسروں کی نشو ونما سے اپنی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ اس میں جسم اور ذات/شخصیت دونوں کی پرورش ہوتی ہے۔

قرآن نے وعدہ فرمایا کہ جو قوم اسلامی نظام قائم کرے گی اس کی اللہ تعالیٰ خود مدد فرمائے گا (47:7, 22:40) اور اس قوم کو غلبہ واقتدار حاصل ہوگا (3:139, 4:141, 58:21, 44:55) اس غلبہ واقتدار کی وجہ سے ہی ارشاد ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً (2:143)-

اس طرح تم کو نگران امت بنایا تا کہ تم لوگوں کی نگرانی کرو اور رسول تمہاری نگرانی کریں۔

اگر آپ کو مسلمانوں کو زندہ کر کے' ان کو غلبہ حاصل کرانا ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ اللہ کا دین قائم کریں اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ ساری انسانیت کی نگرانی کر سکیں۔

مضمون کے آخر میں عمران خان اور اس تحریک کے عمائدین کے لئے دلی دعا ہے کہ وہ قرآنی نظام قائم کرنے کے موضوع پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ اگر ان کو اس بارے میں کسی فکری رکاوٹ کی تشویش ہو تو وہ ادارہ طلوع اسلام سے رجوع فرمائیں' یہ ادارہ ان کے ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ عمران خان کی توجہ کے لئے یہ واقعہ تحریر کرنا مناسب ہوگا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ایک بچپن کے دوست ان کے پاس آئے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اے عمر تم نے رات دن محنت کر کے اور زندگی کی ساری صعوبات برداشت کر کے' اسلامی نظام کو اس طرح جاری کیا' کہ تم نے اسلام کو چار چاند لگا دیئے' اس پر حضرت عمرؓ قدرے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ عمر نے اسلام کو چار چاند نہیں لگائے بلکہ اسلام نے عمر کو چار چاند لگا دیئے۔ ورنہ خطاب کی تو اور بھی اولاد ہے انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ عمران خان بھی اسلام کی خدمت کریں اس کا قرآنی نظام جاری کرائیں' تو اسلام ان کو بھی چار چاند لگا دے گا اور ان کا نام تا قیام قیامت' قرآن کے خدمتگاروں میں شمار کیا جائے گا۔

شکرِ خدا کہ از مددِ بختِ کارساز
بر حسبِ مدعاست ہمہ کاروبارِ دوست

وَمَا عَلَيْنَا إِلاَّ الْبَلاَغُ الْمُبِيْنُ (36:17)-

(اور تم مانو یا نہ مانو) اور ہم پر تو بس کھلم کھلا (احکام خدا کا) پہنچا دینا فرض ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورۃ النمل	(27)	280	225/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ القصص	(28)	334	250/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	350/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	350/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	350/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ضرورت رشتہ

متوسط قرآنی فکر کا حامل گھرانہ، ذات آرائیں، رہائش فیصل آباد، والد ریٹائرڈ آفیسر گریڈ 18، کو اپنی 23 سالہ بیٹی، تعلیم ایم۔اے اردو، کمپیوٹر ایکسپرٹ طالبہ بی۔ایڈ، رنگ گورا، قد 5 فٹ 4 انچ کے لئے رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ: موبائل نمبر: 0300-6664864

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام ایک زندہ نظام حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے دین یعنی نظام حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اور اس کا اصل الاصول امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصور اسلام کی رو سے اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان بایں ہمہ بے بسی و بے کسی انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔ (مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (22:41)۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔ یَعْبُدُونَنِیْ لَا یُشْرِکُونَ بِیْ شَیْئاً (24:55)۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ ﷺ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت یعنی باغ و بہار آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔۔ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر

آپ ﷺ نے فرمایا کہ: نعم النصر و التمکین فی البلاد۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)۔

اسلام کا تقاضا: یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظام حیات) بننے کا تقاضا' جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام' اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔'' (خطبہ الٰہ آباد۔ ۱۹۳۰ء)۔

اس سے بھی پہلے' انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے' مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں' عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خودساختہ احکام وقوانین کی اطاعت۔ اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ' ان قوانین کا از خود بہ طیب خاطر' اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام وضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

''اسلام' تخت وتاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)۔

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام واصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدرآباد دکن' ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق وتشکیل کی وجۂ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے

اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ: آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجہ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ: **إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ** ۔(43:22)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا جاتا کہ: **أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَى مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءكُمْ** (43:24)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ واجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو' تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں: **حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا** ۔ (5:104)۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظام جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی' اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسولؐ اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ: **ولا ترکنوا الی الذین ظلموا**. دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا' **توفتمسکم النار** ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا' ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات و تصورات زندگی' ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔ **لا الٰہ الا اللہ** ۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے' ہر شے کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ

آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل' عدم حرکت' جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرۂ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے' اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص ۱۲)۔

اس قسم کی بت پرستی میں' ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں' ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم' اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے..... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص ۳۵۸)۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ' اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے' اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی' اپنے اسلاف کی طرح' غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود' اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے' تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے' محض تقلیداً کئے جائیں' تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے' اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں

انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید!
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے اپنا تعارف کراتے یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ۔۔ **انا انزلنہ فی لیلۃ القدر. (97:1)**۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آ رہے تھے ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔''
(خطبہ الٰہ آباد)۔

روشِ کہن: ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دور عباسیہ) میں ہوا تھا، لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان ''بتان عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سر نو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت: ''بتانِ عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ:۔

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرم ﷺ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوح سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ' بانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا ۔کل شئی من امرجاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ ۔

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز: قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر.** (3:109)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی

کے لئے تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ **الدین**' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں۔۔ **لا تملک نفس لنفس شیئا. و الامر یومئذ للہ (82:19)**۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ: **کونوا عبادا لی. (3:87)**۔ تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ: **مالنا ملک. بل لنا امیر** ۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

''یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔''

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔ کہ:

''یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔''

خلافت اور ملوکیت میں فرق: وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے' بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا

محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں' میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں' اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔''

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

''تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔ لہٰذا' مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں: اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زینۃ الحیوٰۃ الدنیا (18:46)۔ کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قرۃ اعین. (25:74)۔۔ کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ انما اموالکم و اولادکم فتنۃ۔ (۸/۲۸)۔ یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔۔ ان من ازواجکم و اولادکم عدوالکم. فاحذروھم (۶۴/۱۴) ''یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے۔۔ فاحذروھم۔۔ ان سے بہت محتاط رہنا۔۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھائی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر

اس سے تجارت کرلیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرادیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔ انکا دستور تھا کہ

''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ۔ ابن جوزی)

عدل: قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔ اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ۔۔ انا جعلنٰک خلیفة فی الارض۔ فاحکم بین الناس بالحق۔ و لا تتبع الھویٰ (۳۸/۲۶)۔ تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی

ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہو گا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد، یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہو گا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)۔

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیل کار:

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔ (۲/۴۸)۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔۔ ''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔'' (۵۵/۴۱)۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔۔ وامتازو الیوم ایھا المجرمون (۳۶/۵۹) تا کہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔۔ لا تکسب کل نفس الا علیھا (۶/۱۶۵)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔۔ ولا تزر وازرۃ و وزر اخریٰ (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں' بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔اس باب میں' اور تو اور' خود حضور رسالتمآب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔(۶/۱۵)۔

اور اس کے بعد فرمادیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔فاطمہؓ۔بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے' ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی' پرائیویٹ مکان میں دی ہے' تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر' اسے ازسرِ نو پبلک میں سزا دی۔۔جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو' تو آپ نے' گورنر' اس کے بیٹے' اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا' کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی' آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد' آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو' خود خدا کا قانون مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔(۴۰/۱۹)۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ 'حسبِ دستور' افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر' ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔۔بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی' کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو' خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ایسی بچی جس گھر میں

آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟: لیکن افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسر اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔۔ کان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۴۸/۲۷)۔۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں' امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ۔۔ ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا ۔۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔۔۔ واتبع ھوٰہ۔۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وکان امرہ فرطا (۱۸/۲۸)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں' تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

> اگر ایک ناک کٹا' سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو' تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے' تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

> تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یادرکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے' کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے' تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔۔ حضورؐ نبی اکرم نے خود فرمادیا کہ انا اول المسلمین۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی' وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے' آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس: یہ تھا عدل۔۔ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی' سوشلزم کی طرح' ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔ Due) کا تعین' پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principales) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں' یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے' اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے' وہ درحقیقت

کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین' معاہدات' رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق' الوہیاتی معیار موجود ہے' ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک نا قابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (Justice and The Social Order)

رزق کا حق: قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ' از روئے قوانین خداوندی حقدار ہے' عدل کہلائے گا اور یہ قوانین' قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے' ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے' ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

(مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (۱۱/۶)۔

قرآنی مملکت' جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے' خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

(مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ (۱۵۲/۶)۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے' رفاہی ہے یا اشتراکی۔۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے۔۔ یعنی تمام افراد معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا' اور' جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے' یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی

پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے اور قرآن کی رو سے زمین پر۔۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ اسے قرآن نے سواء للسائلین ۔(۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ۔۔ لنا رقاب الارض ۔۔ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربٰو کا مفہوم: زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصول دولت کا ہے۔ عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہئے یا سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ۔۔ وذروا ما بقی من الربو ۔۔ ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ۔۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربٰو کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔ (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ربٰو کا مرتکب اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم

کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔لہٰذا قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔۔لیس للانسان الا ماسعیٰ (۵۳/۳۹)۔۔یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔۔یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲/۲۱۹)۔۔''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے سب کا سب۔'' اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔میں نے کہا۔یارسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔(حاکم)

دولت کی تقسیم: کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔۔جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں سوشلزم کا نظام رائج ہے۔اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔اس میں شروع میں مال غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسولؐ اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادہ شدہ کو دگنا حصہ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔اس کے بعد جب افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افراد معاشرہ کو رزق۔۔یعنی سامان زیست۔۔مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ۔۔الا تجوع فیھا ولا تعریٰ۔ و (انک) لا تظمئو فیھا ولا تضحیٰ (۱۱۹۔۱۱۸/۲۰)۔۔نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ

لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامان آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ ولباسهم فيها حرير (۲۲/۲۳)۔۔نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔۔ثيابا خفرا من سندس و استبرق۔ (۱۸/۳۱)۔۔دبیز ولطیف ریشم کے زرکار پردے۔۔سور موضوفة ۔۔مرصع اور نرم ونازک صوفے۔افية من فضة و اكواب كانت قواريرا (۷۶/۱۵)۔۔چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔غرضیکہ۔۔نعيما و ملكا كبيرا ۔۔ (۶۷/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامان آسائش نہایت فراواں۔اور پھر یہ سامان آسائش وآرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فرد معاشرہ کے لئے یکساں۔قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائے۔اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔اس میں سب کا معیار زندگی اتنا بلند ہوگا۔جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔یعنی افراطِ زر یا افلاس ونکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔اور نکبت وافلاس سے پستی ودنائت کے انسانیت کش عیوب و زمائم۔جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراط زر ہوگا نہ افلاس وزبوں حالی' تو ظاہر ہے کہ اس میں' ان سے پیدا ہونے والے عیوب ورذائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔حسد' کینہ' انتقام' تنگ نظری' حرص' ہوس' فریب کاریاں' مکاریاں' سازشیں۔۔اور دوسری طرف بے حمیتی' بے غیرتی' ذلت نفس' تملق' خوشامد' منافقت وغیرہ' یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان' وجہ تنگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔لا يسمعون فيها لغوا ولا تاثما۔۔اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے' نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی واضمحلال پیدا ہو۔۔الا قيلا سلاما سلاما (۵۶/۲۵۔۲۶)۔اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز وآہنگ جاں افروز سناتی دیتی ہے۔۔ونزعنا ما في صدورهم من غل (۷/۴۳) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان' غلط معاشرہ میں' دل میں چھپائے رکھتا ہے۔اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔اس معاشرہ کا اندازہ وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؔ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش

فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب
راز دانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است
از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو!
حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ
از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش!
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبالؔ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

ان ھذہ امتکم امة و احدة و انا ربکم فاعبدون۔۔ (۲۱/۹۲)۔۔اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلاوہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔۔ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم و النبوة ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ (۳/۷۸)۔اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی

کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود اربابِ نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضورؐ نبی اکرم کا یہ ارشاد گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن وخوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولائیت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی، جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جوان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔۔ عبداللہ۔۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے، کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ

حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہی۔ یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد' زر اندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہوسکتا۔ اس میں' تمام افراد مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی' کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا' اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے: اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے' اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسمیں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور' ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا' تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا' اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد' اس کے زور بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؔ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے' تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے' چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں' اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں' کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے' محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ' وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان' معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان' کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔ (۲۳/۵۱)

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا' تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف

اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا' وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔ وکلا منھا رغدا حیث شئتما (۲/۳۵)۔۔ وہ جہاں سے جی چاہتا' پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔۔ یخرجنکما من الجنة فتشقیٰ (۲۰/۱۱۷)۔۔ وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا' جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بعضکم لبعض عدوا (۲۰/۱۲۲)۔۔ کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے' آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد: قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ۔۔ ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)۔۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا' جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی' اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل' وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں' ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ۔۔ انا بشر مثلکم۔۔ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر' یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے' انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار' شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو' اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔ اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ ''چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن: وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ۔۔ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔۔ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیر دستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی

وجہ کچھ بھی ہو۔لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ۔۔الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ۔۔کس قدر قابل حمد وستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔۔الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب (۳۵۔۳۴/۳۵)۔وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین ۔۔سے ہوتی ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے والا۔۔جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔یہ مملکت بھی اسی لئے مستحق حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔وہ سزاوار حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ان کے برعکس' دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۷)۔ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے' تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ۔۔لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (۹/۷۶)۔ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا' ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے' ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا' نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ۔۔یقسم المال صحیحاً۔۔وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔آپ نے فرمایا

کہ۔۔بالسویۃ بین الناس ۔۔تسویہ کے معنی ہوتے ہیں' کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔استوی الرجل ۔۔کے معنی ہیں' اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃ کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔اسے دعا کہتے ہیں۔حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے' اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت وامامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؔ) نے' یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان' اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین وجمیل پیکر ہوتا۔۔

لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز' اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ۔

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے' اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور

جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

واتل علیھم نبا الذی اتینٰہ اٰیاتنا

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذالک مثل القوم الذین کذبوا بأٰیٰتنا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔۔ فاقصص القصص لعلکم یتفکرون ۔۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔ ساء مثل القوم الذین کذبوا بأٰیٰتنا ۔اف! کس قدر بری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ۔۔ و انفسھم کانوا یظلمون ۔۔ وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا ۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا۔۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔۔ اولٰئک کالا نعام ۔۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں۔۔ بل ھم اضل ۔۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔۔ اولٰئک ھم الغافلون (۱۷۹/۷)۔۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا، اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوبات

5 فروری' 2012ء' لاہور۔

محترم جناب ایڈیٹر صاحب' ماہنامہ طلوع اسلام' لاہور۔

السلام علیکم۔

عرض ہے کہ آپ کے مؤقر جریدے کے فروری 2012ء کے شمارے میں محترم جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کا مضمون بعنوان ''اقبال کی ناپسندیدہ شاعری'' شائع ہوا' بہت پسند آیا۔ مزاحیہ انداز میں علامہ اقبالؒ کی نہایت اہم اور پسندیدہ شاعری کی طرف عوام کی توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ مضمون پہلے آئی ایل ایم کالج سرگودھا کے زیر اہتمام منعقدہ یومِ اقبال کی تقریب میں پڑھا گیا۔ پھر 25 نومبر 2011ء کے روزنامہ جنگ لاہور میں ایڈیٹوریل والے صفحہ پر دو بڑے کالموں میں یہ شائع ہوا اور اس کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر یہ طلوعِ اسلام لاہور کے مذکورہ بالا شمارے کی زینت بنا۔ مضمون کے عنوان ''اقبال کی ناپسندیدہ شاعری'' کا حقیقتاً مطلب ہے اقبال کی نہایت پسندیدہ شاعری کا وہ حصہ جو عوام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے لیکن اسے عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جاتا رہا ہے اور اب عوام کو اسے فوراً توجہ دے کر اس سے مستفید ہونا چاہئے۔ اگرچہ مضمون کے پہلے جملے میں ہی مضمون نگار نے اپنے آپ کو اقبالؒ کی صناعی کا قائل (یعنی ان کے کلام کا شیدائی) ظاہر کر کے واضح کر دیا ہے کہ ماضی میں کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اقبالؒ کی یہ نہایت پسندیدہ شاعری عوام کے سامنے نہ آنے پائے۔ یہ مضمون مضمون نگار کے فنِ مزاح نگاری کے شاہکاروں میں سے ایک معلوم ہوتا ہے۔ فنِ مزاح نگاری میں بعض دفعہ استعاراتی زبان بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ لیکن بعض کم فہم اور روایتی لوگ ان شاہکاروں کو Appreciate کرنے کی بجائے Depreciate کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے علامہ

اقبالؒ کو بھی استعاراتی زبان استعمال کرنے کی نوبت آتی تھی۔ جیسے وہ فرماتے ہیں:

شریعت کیوں گریباں گیر ہو طرزِ تکلم کی
چُھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

آپ کی وساطت سے مضمون نگار ممدوح جناب عطاء الحق قاسمی سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ مضمون ہذا کی انتہائی اہمیت و مقصدیت کی وجہ سے براہِ مہربانی اس کی کم از کم ایک مزید قسط روزنامہ جنگ لاہور کی کسی قریبی اشاعت میں شامل فرما کر شکر گزار فرمائیں اور اس قسط میں جناب انتظار حسین (بندگی نامہ) کے 13 جنوری 2012ء کے روزنامہ ایکسپریس لاہور میں شائع ہونے والے مضمون بعنوان ''میثاقِ مدینہ کیا کہتا ہے'' (جس کا متن نیچے دیا گیا ہے) پر عوام کی راہنمائی کے لئے اپنا تبصرہ بھی شامل فرمائیں:

''میثاق مدینہ کیا کہتا ہے

کیا آپ کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال کے خطبات کا مجموعہ The Reconstruction of Religious Thought in Islam سعودی عرب میں ممنوع ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال بتا رہے تھے کہ وہاں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جہاں یہ مجموعہ خطبات بھی زیر بحث آیا۔ خلاصہ بحث یہ تھا کہ اس کتاب سے اجتناب برتنا چاہئے۔ سو اب یہ کتاب سعودی عرب میں ممنوع ہے۔

اصل میں قائداعظم لائبریری میں ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ موضوع تھا' قائداعظم کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ ملک میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اور ریاست کے مختلف ستون جس طرح آپس میں ٹکرا رہے ہیں اس نے فضا کو پہلے سے بڑھ کر گمبھیر بنا دیا ہے۔ سو بس ذرا چھیڑنے کی دیر تھی یار لوگ ابل پڑے۔ کیا قائداعظم یہ پاکستان چاہتے تھے جو اب اس کا نقشہ ہے۔

اس مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر جاوید اقبال کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے سمیٹا۔ وہ بھی لگتا ہے کہ بھرے بیٹھے تھے۔ اس مباحثہ میں قائداعظم کی 11 اگست 1947ء والی تقریر کا حوالہ آیا تھا۔ انہوں نے سیدھا حوالہ میثاق مدینہ کا دیا اور سوال کیا کہ کیا قائداعظم کی یہ تقریر میثاق مدینہ سے انحراف ہے۔ اگر ہے تو بتایا جائے کہ کیسے؟ انہوں نے وضاحت کی کہ میثاق مدینہ کے تحت جو مدینہ اسٹیٹ قائم ہوئی تھی اس اسٹیٹ یا اس مملکت میں تو عیسائی بھی تھے' یہودی بھی تھے' مشرکین بھی تھے۔ میثاق مدینہ نے ان سب کو وحدت قرار دیا تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھئے اور پھر پڑھئے قائداعظم کی وہ تقریر۔ تو پاکستان میں اقلیتوں کو جو مشکلات درپیش ہیں اور جس کے بارے میں نیلم بشیر نے سوال اٹھایا تھا اس کا جواب تو میثاق مدینہ

کی وضاحت میں آ گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت سے ایک مثال پیش کی۔ بتایا کہ اس زمانے میں ایک واقعہ یہ گزرا کہ کسی نے ایک یہودی کے گھر کو ڈھا کر وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی۔ حضرت عمرؓ تک جب یہ شکایت پہنچی تو انہوں نے فوراً اس مسجد کو مسمار کرنے کا حکم جاری کیا۔

یہاں سیکولرازم کا بھی تو سوال اٹھا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ وضاحت تو قائداعظم نے پہلے ہی کر دی تھی کہ پاکستان کو تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں بنایا جائے گا۔ باقی سیکولرازم کا تو ہمارے یہاں ترجمہ ہی غلط ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کا مطلب ہے لادینیت۔ سیکولر سٹیٹ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ لادین مملکت ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اس تصور کا پس منظر کیا ہے۔ یورپ میں مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ پادری حضرات کو اصرار تھا کہ انجیل سے جو قوانین اخذ کئے گئے ہیں وہ اٹل ہیں۔ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اس تصور کو چیلنج کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں سیکولرازم کا تصور وجود میں آیا۔ جس طرح جاوید اقبال صاحب نے اس تصور کی وضاحت کی اس کے حساب تو اس اصطلاح کا صحیح ترجمہ ہوگا عیسیٰ بدین خود، موسیٰ بدین خود ریاست کی نظر میں سب برابر ہیں۔

اسلام کے بارے میں انہوں نے وضاحت کی کہ یہاں تقسیم اس طرح ہے کہ ایک ہیں عبادات اور دوسرے ہیں معاملات۔ عبادات میں تو بے شک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر عبادات سے ہٹ کر جو معاملات ہیں ان کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ زمانے کے ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے حساب سے جو بھی اسلامی قوانین ہیں ان میں ترمیم و تجدید ہونی چاہئے۔ سیکولرازم کا تصور بھی یہی کہتا ہے اور اجتہاد کا اصول بھی یہی کہتا ہے۔ انہوں نے اس میں یہ ٹکڑا اور لگایا کہ جسے نیشنلزم یا قومیت کہتے ہیں وہ خود ایک سیکولر تصور ہے۔ آج اسی حساب سے اسلامی دنیا میں قوموں کی تقسیم ہوئی ہے۔ عربوں کو لیجئے کہ ان کی زبان ایک ہے۔ مگر مصر، عراق، شام وغیرہ وغیرہ سب الگ الگ قومیں ہیں۔

اسلام میں عدل پر کتنا زور ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ خود خلافت راشدہ کے زمانے میں یہ صورت تھی کہ خلافت کے انتظام سے الگ حضرت علیؓ نے ایک ادارہ ناظر المظالم کے نام سے قائم کیا تھا جو اس ضمن میں شکایات سنتا تھا اور یہ کہتے کہتے انہوں نے برصغیر میں سارے مسلمان بادشاہوں کو رگید ڈالا۔ کہنے لگے کہ مغلوں کو اتنا لمبا وقت ملا۔ انہوں نے کیا کیا۔ قلعے اور محلات بنائے، مقبرے بنائے، مسجدیں بنائیں اپنی نمود کے لئے۔ کوئی دارالعلوم قائم کیا؟ کوئی دارالعدل قائم کیا؟ جدید عدلیہ کا تصور تو ہمیں انگریزوں کا عطیہ ہے۔

اسی گفتگو کے ذیل میں اقبال کا حوالہ دیا کہ وہ جو انہوں نے سوشل ڈیموکریسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس تصور کو اپنائیں تو یہ کوئی انقلاب نہیں ہوگا بلکہ ایسا کر کے ہم اپنی اصل کی طرف مراجعت کریں گے مگر ہمارے یہاں جو مذہبی

جماعتیں ہیں مثلاً جماعت اسلامی ہے وہ ایسے کسی تصور کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتیں۔

اس سلسلہ میں انہوں نے ڈاکٹر اسرار مرحوم کا ذکر کیا۔ کہا کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں کہہ رہا تھا کہ اسلام چار چیزوں پر بہت زور دیتا ہے۔ عشق' فقر' جرأت اور آزادی۔ عشق کی جگہ ہم نفرت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ فقر کے تصور کو ہم نے جس طرح گم کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ جرأت کی صفت سے بھی ہم محروم ہو چکے ہیں اور آزادی۔ اس پر ڈاکٹر اسرار نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ اسلام میں آزادی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہم تو اللہ کے غلام ہیں۔

اور ہاں اجتہاد۔ ہم قوانین کے اٹل ہونے کے کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اجتہاد کا اصول جو ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں اسی اصول پر تو زور دیا ہے۔ جب ہی تو یہ خطبات سعودی عرب کو وارا نہیں کھاتے۔ علامہ کہتے تھے کہ تین باتیں مسلمانوں کے زوال کا باعث ہیں۔ ملوکیت' ملائیت اور پیری مریدی۔ ملوکیت کو اب ہم نے موروثیت میں بدل دیا ہے۔ ملائیت اجتہاد کی راہ میں حائل ہے۔ کچھ اسی قسم کی رکاوٹ انہوں نے پیری مریدی کو بھی ٹھہرایا تھا۔''

آپ کا خیر اندیش
محمد اکرم راٹھور

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآن مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

WWW.QURANBREEZE.COM, WWW.TOLUISLAM.COM

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ بیرون ملک **bazmdenmark@gmail.com, PDF.EBOOK**

☆ اندرون ملک' فون: **+92 42 35753666**' ای میل: **trust@toluislam.com**

ایک مقدمہ' اقبال۔۔ دشمنِ دُنیا و دین؟

محمد علی صابر صدیقی صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کے ناول ''بایزید یلدرم'' کے بعد نئی کتاب بعنوان ''ایک مقدمہ۔ اقبال۔ دشمنِ دنیا و دین؟'' شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے ساتھ ایک مقدمے کی شکل میں کلام اقبال اور افکارِ اقبال کے متعلق دلچسپ اور پُر مغز بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب 354 صفحات پر مشتمل ہے جو کہ صرف 300 روپے بزم طلوع اسلام' 25 بی' گلبرگ 2' لاہور سے دستیاب ہے۔ برائے رابطہ: محمد اکرم راٹھور' موبائل: **0321-4460787**

CONCEPT OF GOD

(Letter to Saleem)
By G.A. Parwez
English Rendering By
Brig. Taimur Afzal Khan (Retd)
=====================

My dear boy! Your curiosity about God would perhaps be satisfied only if He were to present Himself before you, in person. It is some mercy that your demand has the innocence of Moses (God's Interlocutor), who had said رَبِّ أَرِنِیْ أَنظُرْ إِلَیْکَ "O God! Let me cast my eyes on You so that my curiosity (of visual perception) is fully satisfied". And that you are not like the Children of Israel, who were cynical and had insisted, لَن نُّؤْمِنَ لَکَ حَتَّی نَرَی اللَّهَ جَهْرَةً "We shall not believe till we have seen God before our very eyes". This my dear, is the difference between a discerning heart and a rebellious mind.

Saleem! First of all, you must understand that whenever human beings talk about God, it is not in fact about Him per se, but varying human ideas about Him, because man's self-created religions have come forth with different individualistic perceptions of God. Such subjective thoughts about God can never conceive monotheism in its totality. God's image in the minds of the poor and the dispossessed would be quite different from that of the rich and the mighty. He would be conceived differently by the successful and the victorious - a conception which would be starkly opposed to the image conjured in the minds of the downtrodden and the vanquished. And if we extend the argument further, James Jeans' God would be diametrically opposed to that of White Head's; so much so that a person would think of God differently, under different sets of circumstances. We would look upon God in a certain mould when we are unwell and quite differently when we are healthy. When biliousness overpowers us, we have a different view of God than when we are phlegmatic. A logical extension of this rationale will bring us to a point where we encounter what we can call the "Tribal God ". A despotic and rebellious nation would have a different image of God than a nation that is oppressed and run down. Likewise the" thugs" have their own God as against the" Kabir Panthis" (the benevolent ones). Similarly, the Israelites' concept of God in their period of glory was different to the concept that developed in their era of decline, when Bethlehem had been ravaged and the Israelites were considered no more than Christ's herd of sheep. The truth expounded so far is but a

condensed version of the general belief that the state of civilization of a nation, in a certain phase of history, is only as good as the type of God they worshipped during that time. Human intellect is incapable of conceiving an abstract truth, outside of its own self. That is why, the image of God created by human intellect is an embodiment of human emotions and propensities. Whatever be human inclinations and feelings, so is the God that emerges out of that crucible. Human intellect has even led man to believe that God created man in His own image. But the fact is that man created God(s) in his own image, with the possible exception that the dimensions that humans ascribe to the Deity's limbs and bodily parts would be phenomenally larger than that of the human beings. As against two hands of man, God would have ten; human fist is capable of clenching a small item while God's hand would be envisioned to contain a volcanic mountain. While humans can drink only a few mouthfuls of water, the Deities are capable of drinking an entire ocean. Or worse still, while ordinary humans at best slap another human in rage, God can be credited to destroy and decimate a whole nation, so on and so forth.

Saleem, I am sure you would reckon as to how weak are the foundations on which the concept of such a II Subjective God II is based; and how often this concept undergoes a transformation, in accordance with the ever changing human perceptions. When Allan Grant or other scholars of his ilk aver that the concept of God is a product of the evolutionary process of the human mind, they in fact are talking of some such perception of a II Subjective God ", whose profile is a creation of man's self made religions. Since the picture of God thus etched is a handiwork of human imagination, it keeps changing in hue and nuance with the ever capricious human intellect.

Now let's move ahead, Saleem! There is yet another complication associated with such a concept of God, which is a figment of the human mind. If you recall, you had narrated the story about Umar Bukhsh and Khudadad to me, who were fighting a legal battle as adversaries. Both would pray to God for their success and also pledge offerings to Him, to seek His favors. And not only that, they would also taunt each other; both claiming that the adversary would one day discover as to how his true God had helped him to secure a victory. Is it not obvious that if both of them were praying to the same God, what a dilemma would it be for Him? Although the claimant and the defendant were both praying to the same God, the decision of the legal suit would obviously be in favor of only one party - and this

is what happened. A logical inquest would suggest that since both adversaries were praying and pledging offerings to the same God, currying for His favors, and only one of them succeeded, then God is supposed to have lent His support to the person who had prayed harder and made larger offerings. In this scenario Saleem, what do you think, emerges out of this discussion? There are a great number of men whose interests clash with one another. There are instances in human history, when an entire nation is pitched against another and every nation prays for their success to God. It is not too far back in history that Hitler went on the rampage in the name of the same God that Churchill prayed to, for launching the counter offensive. This would mean that millions of human beings are invoking God's blessings in their favor while millions more on the opposing side are simultaneously seeking similar dispensation to their advantage, because all humans consider that their God would certainly help them. The question is, under such circumstances, what would be the response of the "God" created by human imagination? If He does nothing and allows worldly affairs to run their own course, then what would be the purpose of having faith in such a "God"? Human beings have faith in God, because they want Him to come to their rescue in their hour of need. But if God were to ignore them in trying circumstances, why should one believe in God, at all? And if God were to take it upon Himself to intervene, then He would be faced with the dilemma as to who should be the beneficiary - Umar Buksh or Khuda Dad; Hitler or Churchill? If He were to tilt towards the person(s) who pledges the most offerings, then would it not result in the same tug of war that we have talked of earlier. In the context of religion and God conceived by humans, the first stage of faith invariably is the pledging and making of offerings. A step ahead of that is the Magic Age, wherein special rites, rituals and magical chants or incantations are employed to compel God to do a person's bidding. "Stand in the stream early morning and recite a certain chant a hundred and twenty five thousand times; you are sure to win the legal battle". Or in other words, if you were to follow this ritual, then God would have no choice but to command the legal decision to be in your favor. On the contrary, if the adversary were to follow a more stringent regime of mystic seclusion, then God would be compelled to arrange a decision in favor of the other person.

This my dear Saleem, is the result when human mind carves an image of God out of its own subjective impulses. Man's self-created religions produce only

such images of God. And this is the picture of God that is scoffed at as an absolute concoction of human imagination, with the implicit insinuation that man unjustifiably believes in the existence of God, whereas none in fact exists.

On the contrary, Deen (i.e. the message contained in the Quran) presents an altogether different perception of God. The Quran puts forth that God is no creation of the human mind, but has an objective existence. God was around when no human mind existed to conjure up an image of Him and would still exist when no human mind would be surviving. He is present - and present with all His attributes, which are permanent and objective. His attributes do not undergo a change in accordance with the prayers of Umar Buksh or the wishes of Khuda Dad. Neither do they conform to Hitler's desires nor do they respond to Churchill's prayers. لَّيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ (Neither according to your wishes, nor in conformity with the desires of the people of the Book).

It logically follows from here that if God is not a creation of the human mind, then what ability does the human mind have - to conceive an image of Him at all. If this be true, then what is the source of information about God? This is the juncture, when God's revelation i.e. "Wahi" is needed - the knowledge that is not a subjective derivative of human intellect but an objective reality, revealed from without. This knowledge is revealed directly to the Messengers by God Himself - that it has been revealed, as the phenomenon of prophet hood has ended. God introduces Himself through such revelation. In other words whatever God wished to communicate about Himself, has been done through the medium of direct external revelation i.e. the "Wahi". Through this source, He has introduced Himself to man, to an extent that He desired and considered necessary. Therefore now, Quran is the repository of all knowledge about God. The elaborations of this very knowledge are termed as God's attributes i.e. the different facets of Absolute Reality. In the Quranic lexicon, these very attributes are referred to as اَسْمَاءَ الْحُسْنٰی Now the vital question arises as to what is my relationship with this God? Why should I believe and have faith in Him? What is the difference between a man who accepts the existence of God and another who does not? What is the gain of the believer as against the loss of the non - believer? God's existence or otherwise should be of no consequence to any one; why should I bother? These questions are of great import and till one has found satisfactory answers to them - that give solace to the heart - necessity and importance of having faith in God cannot be fully comprehended. Therefore, listen

to it carefully! Till now, I have always been putting off this query of yours, as I fully realized as to how complicated and subtle this issue was. I was apprehensive that whenever I broached the subject, you would want to avoid it; and even if you did not avoid it, you would perhaps be induced to sleep. Now that you are so insistent, then pay attention because it has a profound impact on human life. Faith in God or otherwise is not a matter of fun, and do not think that either way, it matters little! This way or that, my dear, changes the total complexion of human life; rather, I would say, it transforms an entire conception of the Universe. This is the axial direction, around which all activities of life revolve.

Well, now listen!

Every person in this world, if not leading an animal life, has a definitive purpose. Since every individual wishes to achieve a certain position in life, he pursues a definite aim, a destination and also emulates a certain pattern. If one wishes to become rich, he would follow the model of a very wealthy man. If one wishes to excel as a man of letters, he would have some famed scholar as a role model before him. On the contrary, famous industrialists of Europe and America would catch the fancy of those whose aim in life is to become great industrialists. Likewise, those wishing to achieve distinction in feats of valour, would be inclined to follow the great captains of war. All these aims and objectives, however, are relative. The moot point is, what pattern should a person follow, if he wishes to become a distinguished" human being" only.

One of the facets of man is his existence at the animal level. Existence at the animal level is purely material, one based on water and clay, whose purpose is preservation of the self and perpetuation of the process of procreation. Such a pattern of existence is neither in need of a definitive aim nor a role model to emulate. But what is referred to as "humanity" is way apart from the concept of animal life. Let us for a while ponder over the various stages of the creation of man. Firstly, various stages of man's creation as an animal have been enumerated بَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ i.e. - the process of human creation was initiated from inanimate matter. This was inorganic life. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاء مَّهِينٍ i.e. then the life multiplied through / the phenomenon of procreation. This was the animal stage. ثُمَّ سَوَّاهُ i.e. then a precise balance was bestowed upon it. This was the next phase of evolution, where life had to assume human proportions. The Quran goes on to say i.e. then God injected His essence (creative potential) into him. The human race by

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (32:7-9) then had acquired the ability to communicate. i.e. then you were bestowed with the power of hearing, sight and sensibility (the heart). Think for a while, Saleem! In all these stages of creation, humanity is initiated from the point, where the energy (the creative potential) of God is injected into life. This enriched state is termed as human personality. This very stage has been named as "Khudi" (the Self) by Iqbal. Thus human life is a manifestation of "God's spirit or creativity "meaning thereby that humans are bestowed with God's attributes. These attributes are present in every human being as realizable possibilities which humans congenitally inherit as potent qualities. Actualization and manifestation of these very qualities is the purpose that the human race has to strive for. This ultimate stage is known as manifestation of the self or self actualization. God possesses these attributes in their ultimate and fully realized form, bearing a balance and proportion, unfathomed by the human mind. That is why, these attributes are called اَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (attributes complete with ultimate balance and beauteous proportion). To achieve this very state of harmony and equilibrium in oneself is the purpose and destination of human life.

Now you decide for yourself, Saleem, as to who should a man emulate, in order to become a human being. The answer is quite obvious that none other than God's attributes can serve as a model for man to follow. Obviously, it is only the ultimate manifestation of the attributes that man is himself bestowed with that can serve as a worthwhile standard for him to strive for and achieve self actualization. صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً i.e. the hue of God, which has no parallel in beauty. This is the pattern that humans are meant to follow as their ultimate aim of life. This, my dear Saleem, is called in the lexicon of the Quran, "Belief in God". This is the state of belief that is demanded of the human race, even if they believe in God of their own accord. That is why, before the Quranic verse صِبْغَةَ اللّٰهِ that I have quoted earlier, is the verse فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا which means: if these people start believing in God, in the way that you believe in Him, then only you may conclude that they would be able to follow the correct path of life.

The upshot of the whole discussion is that belief in God is nothing short of adopting, as an aim of life, God's infinitely beautiful set of attributes اَسْمَاءُ الْحُسْنٰی which have been elaborated upon in the Quran; that is, to demonstrate those latent Godly attributes that are present in man, within the bounds of human circumscription. The "proximity of God "that man achieves is directly related to the

degree to which he can actualize the latent potential that lies within him. Man would achieve "the ultimate nearness to God", when he has, within the precincts of human limitations, realized the complete range of possibilities within him. This is how the Quran has described the aim and purpose of human life (53:42) وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ. Be cautioned, however, that this achievement does not make God out of a man. God's attributes are infinite and that of man are finite and it goes without saying that what is finite cannot become infinite. Therefore, it must bear repetition that " nearness to God" is only tantamount to a reflection of Godly attributes in man, to the extent that is humanly possible; and that too, only those of God's attributes whose reflection is in the realm of possibility for something that is finite.

Ponder over this, Saleem!

1. Since human beings are endowed with God's attributes (or essence), only those can serve as a model for the fulfillment of the human self (personality).
2. And these Godly qualities serve as a guide for all human beings because all of them are bestowed with the same set of attributes; the important element being the commonality of the guidance pattern for all humans.

This aspect is termed as "Tauheed" (Unity of God or Monotheism); that is to say that there is one aim and just one pattern for human kind to emulate لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَحْـدَہٗ لَا شَـرِیکَ لَـہٗ This aim can only emanate from the attributes of a God, who has Himself introduced them to mankind through direct revelation (Wahi) and not from a God, carved out by human imagination. Therefore, it is essential for all humans to believe in such a God and adopt His attributes as presented by the Quran, as an aim of life, because God's revelation (Wahi) in its original and pure form, is not to be found anywhere else. (Adherents of all religions of the world accept the fact that original and unadulterated revelation is not available with them. For details, please refer to my book in Urdu, "History of Supposed Heavenly Scriptures").

Since the true profile and concept of God cannot be found anywhere except the Quran, the Quran is a book that is unique and unrivalled. It is impossible for human intellect to conceive of a God, as presented by the Quran because (as you have seen above), the concept of God created by human mind is individualistic and subjective, and is not an objective portrayal of God.

Now, let us move a step forward!

Whenever any two human beings adopt the same aim for their lives and also

accept the same role model, a meeting of the hearts and the minds is bound to develop. Such a congruity would be referred to as unity of thought and vision. Therefore, logically when the entire human race adopts a unified pattern, all human beings will develop unanimity in their thought and outlook. In other words, "Tauheed" (unity of God/monotheism) would inevitably result in unity of mankind; and there is no other plausible way to achieve unity among humans.

وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (23:52)-

It also goes without saying that if God's attributes are to be the guiding model for us, we should acquire complete knowledge about the various aspects of this reality so that we are in a position to monitor the growth and development of certain attributes within us and can also identify those that still lie dormant and untapped. This is acquisition of knowledge of the book, The Quran. Acquiring knowledge of the book does not imply a mere reading of it, but imbibing it deeply to allow its penetration to the innermost recesses of the heart.

You must have understood by this as to what is the importance of belief in God in the" Deen"? This is the foundation on which the edifice of human life is erected. Since "Deen" describes the form and outlook that life must have, it is inconceivable to order life on the right path without belief in God. Whatever be the pattern emulated, so would be the human life led. Whatever be the aim of life, so would be the actions that emanate from it, because actions are a means towards achievement of the aim. At this point, there is no distinction between means and ends. You would recall Saleem! A short while ago, you had quoted an excerpt from Ferdinand Lassale, the essence of which was something like this:

Let it not be that the aim is defined for us, but the way to achieve that is not, because means and ends in this world are so inextricably intertwined that on changing one of them, the other would automatically change. Every different path leads to a different destination.

Therefore, only correct faith in God can result in correct deeds. That is why, the Quran explicitly states that deeds cannot produce the desired results in the absence of the correct faith in God. Would these Brahmo Samaji Muslims", the protagonists of the wide variety of conceptions of " Worship of God" and " good deeds " ever understand, as to what is the Quranic concept of " faith in God" and" good deeds"? Remember Saleem! Both a journey and aimless wandering entail

walking, but in the former, every step takes one towards the destination, which the traveler reaches at some stage; while in the latter, only walking is involved, the destination is never reached. Therefore, aimless wandering only results in fatigue and weariness. اَولٰئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ

At this stage, you must also understand this important fact that development, actualization and manifestation of these attributes of God is not possible without establishing collective social system and order. The awakening and consciousness of the self "Khudi" (the human personality or the latent qualities of God) comes about only when humans interact with one another. This is the touch stone for a man to evaluate the level of awakening of the self (Khudi) within him. Without a doubt that human personality is unique in itself, but it is also a fact that it is invariably honed and matured in a collective human order. According to Iqbal:

زندگی انجمن آرا و نگہ دارِ خود است
ایکہ در قافلۂ باہمہ رَوبے ہمہ شو

"Life has a collective dynamism, but also keeps a watch over itself. Be a part of the caravan, but forget not your individual identity".

This emphasis on ''بے ہمہ شدن'' highlights the individuality of human self (because individuality is the basic characteristic of selfhood i.e. "Khudi"). In the couplet above, ''باہمہ رفتن'' signifies a systematic collective existence, without which development of the self does not take place. This is the reason that Quran stresses upon an organized social system as the very basis that ensures a complete maturity and fulfillment of the human self. For achievement of this objective, Quran creates a society wherein every individual member becomes an agent for the sustenance, development and actualization of the other members. Such a society is comprised of ربّانیّون , who are one not in body alone, but their hearts are equally integrated with one another. In such a society, every individual lives for the other and prefers others over himself. (59:9) وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ This kind of mutual relationship, which leads to the development of just such a society, is possible only through the belief in God that we have talked of earlier. That is to say, unflinching faith in the fact that the society has a unified aim and every individual considers it an article of faith to ensure sustenance and development of the others.

By now I you would certainly be surmising as to whether this alone is the extent of our relationship with God; that we are meant to achieve accomplishment

in our lives by emulating His example? Certainly not! This aspect is merely a facet of the total relationship; let us uncover the other facet. Be mindful that you do not doze off again! The topic under discussion is one of great importance.

The main characteristic of personality is constituted by independence, freedom and sublimity. Independence implies an ability to maintain one's existence by one self, without any external help and not being dependent on anyone. Freedom connotes a state of self-resolution and free will. God, being Absolute, is غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (rich and deserving of all praise) and صَمَدٌ (sublime) in the ultimate dimensions of these words. Every being, however, by its own will, circumscribes itself by certain self imposed limitations. God has also imposed certain limitations upon Himself. For example, the Quran says",(6:12) كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

"God has taken upon Himself the obligation of providing sustenance and protection to all things in the Universe". This كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ (to bind oneself by obligation) is an example of self imposed limitation. The purpose of these limitations is that whatever be needed for nourishment and development of the Universe, a corresponding attribute of God comes into play to fulfill that need. To comprehend this rather complex notion, you may just remember that under a certain set of circumstances, a definitive reaction from God is activated. This is referred to as the Divine Law; that is, whatever the situation, manifestation of a corresponding attribute of God occurs. Since God's attributes are unchanging, so are His laws un-alterable, firm and universal. لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ God's laws never undergo a change فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيْلاً وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيْلاً "You shall never experience a change and transference of responsibility in God's laws. In every object of the external universe, God's law is prevalent by itself and these objects have no say in the matter nor do they exercise any control over their own affairs كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ(all are in a state of subjugation before Him). Man, however, has been given the choice to lead life according to the laws of God or repudiate them. فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ : Man has the prerogative to perform, whatever action he may choose. But he does not have the authority to act in a certain way and produce result of another kind. As you sow, so shall you reap. This is due to the fact whatever action is initiated from man's side, the corresponding attribute of God is manifested as its reaction. This phenomenon is called the Law of Retribution. Everywhere in the Quran, you will find, "if you act in this manner, God will do this", meaning thereby that in response to your action, God's law will produce a definitive

result. Corresponding to every action that you take, a certain attribute of God will manifest itself. For instance, one of the attributes of God is ہادی, the one who guides and directs. God says in the Quran.(29:69) وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا : those who shall strive to find the path of God, we shall guide them onto those paths, that are ours. That is to say, that if someone strives to find the way of God, from God's side, His attribute of guidance shall come into effect. Or else for example.

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ (7:96)-

"If the inhabitants of colonies had been believers and acted in accordance with the law of God, God would have opened for them the gates of the blessings of the earth and the heavens". It means that if they had acted in that fashion, God's attribute of magnanimity would, have been in full display. وَلَـكِن كَذَّبُواْ فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ "But they violated this law and we punished them for their deeds." This is the Quranic lexicon, which is referred to as "مَشِيَّتُ" the Will of God. The Quran has repeatedly elaborated upon the fact that if you wish for a certain attribute of God to come into effect, you have to act in a certain, definitive way.

By now, you would have understood, Saleem, that in the concept of God, carved out of human imagination as presented by religions, God moulds Himself in accordance with the wishes of each individual. Therefore, it is the desire of every man to cause God to tilt in his favor. Umar Baksh would expect Him to tilt in his direction, while Khuda Dad would want his favors for himself. In every legal battle, the claimant or the plaintiff would demand God's attention for himself, while the defendant or the accused would similarly look for His favors to his advantage. But in "Deen", the concept of God is one of a universal, firm and un-wavering law giver, who steadfastly stands His ground and is inclined towards no one. Every action bears a result according to His law; a correct action would bring about a correct result; that is all there is to it (3:161) ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ Whoever wishes a particular kind of result should conform himself (and his actions) accordingly, the (desired) result will occur.

رمز باریکے بحرفے مُضمر است
تُو اگر دیگر شوی او دیگر است

"There is a subtle truth latent in these words; if you change, so would He".

A farmer who wishes his fields to be irrigated, would have to prepare his fields along the flow of the water, because water flows towards the lower slope. Whoever prepares his fields in accordance with the universal laws governing water,

would see for himself a practical depiction of the words: جَنّٰتٍ تَجرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ Whosoever locates his fields higher than the water course, thereby repudiating and violating God's law (termed as negation and disobedience), would be denied both irrigation (fertility) and the harvest. In such a situation, there is neither room for any perplexity nor a tug of war. There is no question of any form of recommendation or sycophancy either. These decisions are determined by God's laws; these are called "decrees ", and you are well aware that decrees never change.

Till now, we have talked of the solidity (the unchanging nature) of God's law. Now let us ponder over its universality. Just as God's law is prevalent in equal measure in all parts of the cosmos, it produces similar results everywhere in the human world. Fire is as much a source of heat for an eskimo of the North Pole as it is for a negro of Africa. The Queen of England breathes just as the shepherd of Tibet does. In the application of these phenomena, there is neither a distinction on account of geographical boundaries and limitations, nor any discrimination on the basis of colour and creed. Neither is wealth a criterion, nor a person's worldly status and authority. These laws are neither tribal nor nationalistic; nor are they based on considerations of race and country. Whatever be the state of these physical laws, the laws governing the humankind are just as truly applicable and equal for all of humanity. The God whose concept was discussed above, is the sustainer of the Universe, the human race; is the mentor for all and sundry. Should a human being, belonging to any region, race, colour or creed adopt God's law and emulate His example, he would also be a "Rabbani "(a nourisher). This group of "Rabbanis" irrespective of their relative affiliations of race, country, colour and creed constitutes a unified nation. That is why the Quran refers to this group as the" Momineen " (the true believers) because the raison d'etre for their cohesion and partnership is the faith in God's law. This faith is the basis of their unity. That is to say, the group of humans, who share common perceptions, and adhere to the same law and pattern of life. The "Deen" through the Quran has presented the picture of just such a community of believers in God. This God is equidistant from all individuals, just as the centre of a circle is from all points that describe the circumference. Anyone who adopts God as the role model, finds Him near to him. (2:186) اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ When the faithful inquire about me, tell them that I am near them" Nearer than their jugular vein. نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد Whoever adopts His law as the guide, would find the law always on his side; whenever, he

calls out to the law, the law will respond to his call. (2:186) أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ "I respond to the call of every caller". This should be the characteristic of a Universal Law. Besides being universal, the law of God is all penetrating and pervasive, to the extent that it even encompasses the entire range of human thoughts that germinate in the mind and the perceptions that pass before the eyes. This law is so result oriented that not even the slightest mo,!-~men~ of the heart and the body passes without creating an impact. (99:7-8) وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ ○ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ Just reflect for a while, Saleem! How much of self confidence does belief in such a God (that is belief in the solidity of such a law), generate in the human psyche. If man acts in accordance with the dictates of this law, no power on earth can shake his faith that his hard work will not be in vain and he will be able to produce the result that he had anticipated. Opposition from any quarter, whatsoever, will not create fear in his mind that he would fail. Therefore, he will not be overtaken by fear or beset with grief. On the contrary, he would be able to confidently claim, in circumstances that apparently seem extremely adverse and without a ray of hope,: (9:40) لاَ تَحْزَنْ إِنَّ اللّهَ مَعَنَا "Fear not, how can we be unsuccessful, when we are acting according to God's law". Such a man when faced with adversity, does not commit suicide out of despondency, but stops right there and ponders as to where he had deviated from the path described by God's law. Since God's law is known to him with all its explicit details, it is not difficult for him to determine as to where he had drifted in the wrong direction. Having determined the error, he retraces his steps back to the cross-road, where he had erred. This juncture is known as "Tauba" (repentance), and thereafter man once again starts travelling along the straight path, laid down by God's law.

Let us have your view point, Saleem! Does belief in this God generate true reverence for Him or a belief in the God, conjured by human intellect before whom Umar Bukhsh and Khuda Dad pledged their offerings and wished for a decision of their legal suit in their favor.

Man gives up faith in that God when help is not forthcoming from Him and (understandably too!). But when this God (that is the true God of the Deen, whose all embracing law is firmly established) does not come to someone's help, the believer's faith is reinforced and he attributes his failure to his non-adherence to God's law. That is to say that both his success and failure result in fortifying his faith in the dictates of this law.

It can be well understood from this that belief in the law established this God also rids man of the dilemma that believers in the individualistic image of God, created by human mind, suffer from. In the case of the individualistic image of God, both Umar Bukhsh and Khuda Dad are tugging at Him towards themselves. But in case of belief in God's law, succour would come to those who are in conformity with the law. If Umar Bukhsh and Khuda Dad have a conflict between them, it means that either both of them are incongruent to God's law, or at least one of them is deviating from it. The one who is not in conformity with God's law, has no right to expect help from it, even if he were to keep verbally praying for it. Only those who are concordant with the law of God can get approbation and success. If he also starts conforming to this law, both of them would be in harmony, thereby bringing an end to their conflict automatically. (Saleem, you would have read a basic rule of geometry at school that things that are equal to another are also equal amongst themselves). Umar Bukhsh conformed to God's law whereas Khuda Dad did not; therefore, there was a state of conflict between them. When Khuda Dad also became concordant with the same law, there remained no difference of opinion or conflict between them. The matter stood resolved.

Now, you would be disturbed by this thought that while the manifestation of God's law can be seen in a most distinct and a firmly established manner in the universe externally, not only that its application in the human world is not to be experienced anywhere, the situation appears to be rather to the contrary. For example, God's law explicitly states (6:135) إِنَّـهُ لاَ يُـفْـلِـحُ الـظّـالِمُون : those who do not fulfill obligations of human rights, will not prosper. But we experience that the cruel keep prospering and those honest and just people, who are mindful of others' rights are suffering everywhere. These are the ways of the contemporary world. This is a very important question and needs to be understood with utmost of attention. A tumble in understanding at this stage, has led many a men of letters and intellect astray. One of the difficulties that is faced in making you understand is that one cannot talk to you in philosophical terms. I have repeatedly insisted that if not at any great length, you should at least acquire knowledge of the basics of philosophy, but you have never responded. But why should you bother? You would only listen, if you had a problem. I am the one facing the difficulty. گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل "I have to talk in somewhat complex terms, otherwise it is difficult to talk at all". Therefore, anything that I can otherwise explain in a few words, has to be said in four pages.

Anyway, try to listen and understand!

There are some aspects of the law of nature that we experience all the time. Water flows towards the lower side; fire generates heat; things fall down because of earth's gravitational pull; and lighter things ascend / because of the wind etc etc. But the part of nature's law that is more important, delicate and subtle is the fact that effects of natural laws d~ not appear suddenly. Scientists, who have inquired into the "Theory of Evolution" would confirm that for a very minor change in a certain species, nature is at work for thousands of years. Stages of evolution occur so slowly that like the hour hand of a clock, their movement is hardly perceptible. This is that rate of change, about whose measure God has said in the Quran that one day according to God's system is equivalent to a thousand years and fifty thousand years of human estimation. That is why evolutionary changes cannot be seen by the human eye, nor can they be perceived by the human mind. Not only that this perception is not possible for one man, even after ten or twenty generations, these changes do not physically appear in a perceptible form.

This process of change is called the law of gradation and graduated change; that describes, the intervening interval between the beginning and the end of a change. The change in fact starts occurring right from the point of initiation but we start appreciating it only when it appears before us after its complete manifestation in a visible form. You would recall when last year, you had placed the water on the stove for heating and I had asked you after five minutes if the water had become hot. And you had said, "so early?" On this I had remarked, "Saleem! Be mindful of what you say. The water has certainly become hot in five minutes, it is just that you are not perceiving its heat. Check it with a thermometer and you will feel the heat". This is the law of graduated change, that is the step by step occurrence of the change; the intervening phase between action and its consequent result. This is also known as " Tajeel ", the definitive time period that is required for a change to occur, just as a certain time must elapse before a drop of water is transformed into a pearl.

Just as this law is prevalent in the physical universe, it is also applicable in the human world. The intervening phase of time between an action and its result is inexorable. قُلْ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ Just as in the material world, the dimensions of this waiting period are very large, the periods fixed for results of actions to consummate are also very long. The Quran says: وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ

These people say that if violation of God's laws brings about devastation, then where is that devastation? Tell them: وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ wait for a while, God's law is unalterable. It can never fail to produce the determined consequence, but for that His measures are different (22:47) وَإِنَّ يَوْماً عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ. According to God's system and estimates, one day is equal to a thousand years of your estimation. The Quran refers to this fixed period of time as اَجَلٍ مُسَمّٰی and اَجَلٍ مَعدُودہ. But there is an allied fact worth remembering. While in the Cosmos, everything is shackled with the dictates of law, and the speed of the consummation of results cannot be interfered with, there exists a possibility for this in the human world.

We have seen earlier that by law is meant the manifestation of a definitive attribute of God over a certain event. We are also aware that within human limitations, humans possess the same attributes. And if these qualities are honed and nurtured, they like God's attributes are actualized and produce similar results.

In a human society, where these attributes of its members, honed and nurtured, manifest themselves at appropriate junctures in their life, the efficacy of God's law and the consummation of its results would be quickened manifold. This would mean that if potentialities of human beings become fully congruent to the laws of God, these very laws will produce results at a much faster pace سَرِيعُ الْحِسَابُ. This is meaning, my dear Saleem, of this verse of the Quran إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ . "If you will help God's laws, God's law will come to your help". This was the juncture, to which it was alluded during the Battle of Badr "You were not shooting those arrows, We ourselves were shooting them". The partnership between the members of a Quranic society and God's laws has been described by the Quran as نزولِ ملائکہ (descenscion of the angels). In the Battle of Badr, this very descenscion of the angels has been referred to. Likewise, for ordinary circumstances as well, God has said that (41:30) إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ "Those who make a claim and then steadfastly stand by it that God is their nourisher and sustainer, angels descend upon them". "Malaika" (the angels) are those forces, that acting in accordance with the Law of God, make actions produce results. In a Quranic society, the honed and developed attributes (essence of God) of the members of the society and these (angelic) forces become mutually congruent and in this manner, the consummation of this law becomes faster than ever and consequences start to appear more rapidly. They become rapid to the extent that this community, can with confidence say to its adversaries يَا قَوْمِ اعْمَلُواْ عَلَى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ Oh! my adversaries!

You may continue to do what you wish to; I am busy doing my duty. فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ, the result will before very soon and it will be known that مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ who is eventually to be successful. At that time, you will see it for yourself that how true God's law is that (6:135) إِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ "Oppressors shall never prosper".

This my dear Saleem, is the methodology to see the results of God's law manifested and transparently visible before our very eyes. In order to understand it more clearly, let us examine two examples in this respect. In the universe, God's attribute of creativity is at work at all times. But you have seen with regard to the theory of evolution as how slow is the pace of these phases of evolution. But when it is complemented by man's attribute of creativity, not only that the process of creation is much accelerated, but also becomes unique and multi-faceted. Cotton placed in the sun only becomes warm, but does not produce a flame. However, when the same sun rays are made to filter through a manmade" fire/magnifying glass", a flame is produced instantly. You must have read the dialogue between God and Man in Iqbal's "Payam-e-Mashriq". Man boasts of such like playful innovations, when he says:

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
مَن آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نو شینہ سازم

"You created the (darkness of) night; I created the lamp (to counter it). You created clay and I fashioned it into a cup. You created the mountain, the desert and the desolate empty space; I created the flower beds, the parks and the gardens. I am he, who makes a mirror from a rock; I am the one, who prepares an antidote from poison"

After this, let us now examine God's attribute of providing nourishment and sustenance. You have come across the meaning of "Rabubiat" (nourishment/development) many times. The development of something from its point of inception to complete maturity - as in the poetic metaphor, a droplet of spring rain enclosed in a shell, gets nourished to be transformed into a pearl; but this process is not in the least perceptible and spreads over a very long time. It is in this vein that Ghalib has wistfully observed:

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گوہر ہونے تک

(Let us see, what a drop of water has to go through to become a pearl)

Because in the context of God's law:

آہ کو چاہئے اک عُمر اثر ہونے تک

But if human beings establish a system of sustenance in the society and every human being acts as a " Hurabbi " (a sustainer, a nourisher) to the other, then you would observe spectacular results being produced - how fast the star studded grains of Hijaz bring about a consummation of the latent human potential and how the " Hiraj ", the journey from the earth to the heavens, is accomplished with lightening speed. This becomes possible because in this fashion, alongside God's universal programme, the earthly endeavours of these highly developed human beings complement the process; and in this manner, all the stages of development are covered in a visible, manifest form. That is to say that in this" Nizam-e-Raboobiat" (the system of nourishment and development), an environment is created, wherein every human effort produces a corresponding result in its fullest measure (3:161) ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ (At the time of reckoning, each individual/action will be rewarded in full measure, without favor or wrong).

Now, you must consider this aspect of "Unity of God or Monotheism" in co-relation with the human society and see as to how much eternal happiness and possibilities of development lie therein. It is quite evident that humans are desirous of leading a peaceful life. Be it an individual, a group or a nation, all seek peace. Whosoever you may ask would complain that peace is not to be found. Humans have come to this conclusion after historical experience spanning thousands of years that true peace is only possible in a society, where life is governed by a constitution and laws that emanate from it. In a country where lawlessness prevails, no one from an emperor to an ordinary labourer, can lead a life of peace.

This too is a reality that more tranquil the environment, more would be the opportunities for human potential to blossom and be nourished. Therefore, reflect over the various nations of the world. A country that is strictly governed by law and constitution, produces humans with more developed human faculties. By law is meant the knowledge possessed by all and sundry that a particular action will produce a certain result, and there is a system of accountability in force. Anyone who adheres to the law will not face any restrictions or excesses of any kind; and his life, property and dignity would all be protected. An air of peace and security un-shackles the human beings from the fear that grips their psyche in oppressive societies. Whatever the degree of conformity of life to law and constitution, so

would be the corresponding freedom enjoyed by man. This state (of relative bliss) is attributable to the worldly constitutions and law, which are not entirely stable, firm and unalterable. In contrast, examine the law that is formulated on the basis of the Unity of God. By such a law, is meant:

1. There is just one law that governs the universe, which does not discriminate among human beings.
2. This law predominates over all other laws; no worldly law can vanquish it.
3. This law is so stable, un-alterable and certain of producing results that it has no probability of error or omission. The solidity of this law is evident from the fact that while humans have the discretion to act in any manner that they like, but the law has no prerogative to produce a result as it pleases. Whatever be the path that men choose, the law is bound to produce a result in accordance with it.
4. Even the human beings who enforce this law have no liberty to change it. Neither a recommendation of any quarter is accepted nor any favors are extended. Neither any excess is committed against anyone, nor is an innocent person apprehended.

Ponder over it, Saleem! What would be the state of peace and tranquility in a society, where such a law is enforced? Elements of fear and grief cannot ever find a way into a society such as this. Every law abiding person would be safe from any kind of fear. Such is the society about which the Quran says:(2:38) فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلاَ هُمْ یَحْزَنُونَ (The one who adheres to God's law is protected from both fear and grief).God is Great! What a sense of security! To what extent would the dormant human potential of people living in such a society flourish and how much would their latent capabilities manifest themselves. Remove the fear of lawlessness from the nerves of human beings; their capabilities will automatically be polished. This was the reason Saleem, that the Prophet (PBUH) was able to bring about such an awe inspiring revolution in such a short time, not only in the world of civilization, but also in the world of human psyche. What did the Prophet (PBUH) do in this regard? He transmitted God's law to the mankind and also enforced it in the society. Amongst humans, the greatest personality could only be that of the Prophet of God (PBUH). First of all, he proclaimed that his status was not that of a ruler but of a follower of law اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. I am the firs adherent of this law. You should always keep this fact before you that لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه means that law emanates from God alone and from no one else; and مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ; that the position of Muhammad (PBUH), despite being the greatest of all human beings, is only that of a man, responsible to communicate God's law to the human beings. He (i.e. the Prophet) too does not

have the right to enforce his own injunctions on people. God does not allow anyone else to share this role with Him. لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا When people became convinced that in that society, subservience was only to the law - a law which cannot be changed by any human being - they were relieved of the psychological pressures they were subjected to (7:157) وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. Relieved of this burden, people started to enjoy liberty in the true sense of the word. Their capabilities began to blossom, be nourished and within days, those same camel grazers became bearers of the best human abilities. Western historians, despite lifelong research cannot comprehend as to how had the Prophet (PBUH) brought about such a mind boggling revolution? The basic fact was that the society had acquired peace and tranquility through the application of law and the inexorable result was a development of the human potential. Humans have enormous capabilities within them. When these capabilities suddenly surface like this, the dynamics of the resultant revolution know no bounds. Humans, whose capabilities have been so manifested, do not remain human in an ordinary sense of the word; they are way beyond. Human beings whose abilities are still latent and suppressed cannot compete with such developed humans. We - the slaves through generations - are incapable of fathoming Saleem, as to what difference can potentialities that have blossomed bring about in a man? We cannot even claim that at any particular instant of our lives, we were subordinated to no one but God's law. This was such a great honor that when Hazrat Umar (may God be pleased with him) passed through the valley of Sub hanan, he climbed down from his ride and prostrated himself before God. His companions asked him as to what particular reason was there for him to prostrate at that place? He said that he (Umar) used to graze camels in that meadow and his father was such a tyrant that he would beat him to pulp. That was the status that he had at that point in his life and now he was in a state, when there was no impediment that separated Umar from his God. Saleem! Is there anyone on the face of this earth today, who could make a similar proclamation as Umar that:

"There is no power acting as an impediment between him and his God." This was the true liberty and independence that true allegiance of law had conferred upon them and this very independence had resulted in elevating the cattle grazing Umar to the most prominent position in the world. And why talk of Umar alone, that entire society had assumed the status of an international nation. You have read in my book" Miraj-i-Insaniyat", the gigantic role that the Prophet (PBUH) had himself played in bestowing this freedom upon this nation; therefore, it is not important to repeat it here. Briefly, keep this in mind that throughout his life, apart from the laws of God, the Prophet (PBUH) had not imposed even the most trivial of matters upon

these people. That is why, when the Prophet{PBUH) said something to anyone, even the most ordinary of men (from the stand point of our present day social rankings) had liberty to ask as to whether that was an injunction from God or Prophet's personal opinion. And if (the Prophet PBUH) said that that was his personal opinion, the person concerned would calmly reply that he understood his own affairs better; therefore, could not accept the Prophet's opinion. On such an exchange, neither that person had any apprehension as to what would be the consequence of such non-compliance, nor did the one, who gave the opinion, take offence to the fact that his suggestion had not been accepted.

This is the effect, on a Quranic society, of the constitutional aspect of Unity of God!

Saleem! This is the God that the Quran demands us to believe in. In a few words, go over it once again, that God is not a creation of the human mind, but an objective being, which is the Absolute Reality. This God is introduced to the mankind through His attributes, which He himself has revealed through his message, the" Wahi ". And this" Wahi" exists in this universe only in the Quran. On the one hand, the attributes of this God become a role model (a pattern to emulate) for the human beings; while on the other, they manifest themselves in the form of a universal law that acts as the proverbial blood stream, running through the veins of the cosmos. Irrespective of whether any one is a claimant or otherwise of belief in God, belief in just such a God is demanded of the human kind. At the time of the revelation of the Quran in Arabia, there were the people of the book, who proclaimed faith in God, and there were others besides them, who without any religious affiliations, believed in God. (In history of the Arabs, such persons are called the" Henafa"). The Quran says that whether it be the Jews or the Christians, who proclaim faith in God within the confines of narrow religious groupings, or they be among those who claim to be believers in God without such groupings, their belief is not in conformity to what God's revelation, the" Wahi " has presented in the Quran. Therefore, it is equally incumbent upon them to proclaim belief in the Quranic God, denovo, just as it is important for those who repudiate God. Because as far as the Quranic God is concerned, the faith of these so called believers is as good as the repudiation of the non-believers. So long as they do not start believing in the Quranic God, they will not be guarded against the damages posed by the

forces that are inimical to the development of human ability. Be with me, Saleem! How explicitly has God explained this concept in these words:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَالَّذِيْنَ هَادُواْ وَالصَّابِؤُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وعَمِلَ صَالِحاً فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ(5:69)

"Those who claim to have belief in God (without adhering to any religious groupings) or those who have become Jews or Sabis or Christians (and believe in God in accordance with their individual interpretations; this belief on their part is not belief in the true God). Those amongst them, who will believe in the God presented by the Quran and the life hereafter according to the law governing retribution of actions and thereafter will act upon (the Quranic programme) that develops human capabilities, will be amongst those, who would remain protected against fear and sorrow".

The same fact has been repeated at another place, in these words:

فَإِنْ آمَنُواْ بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَواْ (2:137)

If these people will also believe in the way that you believe, then ways for advancement will open for them. Those who refuse to accept this God as the aim of their lives and refuse to accept His law as the Universal Law or will adulterate the concept of God with their own concepts and will consider any other law, apart from His law, as the operative instrument, will not have the prosperity of life bestowed upon them. This dear Saleem, is belief in God and the meaning of non-belief "Kufr" or "Shirk" causing adulteration by mixing other concepts into the Quranic philosophy.

The letter has become far too long; therefore, your insistence that I should briefly introduce the attributes of God to you and what will be the profile of humanity in the society that is composed of human beings!' in whom manifestation of these attributes has occurred, should be put off for another time.

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتوصد حساب باقیست

"Wine and the moon are still there; there are numerous matters that we have to settle between us".

Blessings

July, 1952 A.D.

==========